تفسیر
سورہ فاتحہ

از

حضرت مولانا سید محمد شاہ قطب الدین حسینی صابری علیہ الرحمۃ
سجادہ نشین و سابق امیر جامعہ نظامیہ

ناشر
اشاعت العلوم صابریہ
درگاہ حضرت شاہ خاموش قدس سرہ
نامپلی، حیدرآباد۔ انڈیا

تعداد طباعت : ایک ہزار جمادی الاولی ۱۴۲۴ھ جولائی ۲۰۰۳ء

کمپیوٹر کمپوزنگ : جامعہ نظامیہ کمپیوٹر سنٹر حیدرآباد

طباعت : مطبعۃ ابو الوفاء الافغانی جامعہ نظامیہ حیدرآباد ۔ فون 24416847

قیمت : ۲۰ روپئے (بیس روپئے)

ناشر : اشاعت العلوم صابریہ درگاہ حضرت شاہ خاموش قدس سرہ

ملنے کا پتہ

اشاعت العلوم صابریہ

درگاہ حضرت شاہ خاموش قدس سرہ

فون: 24802530 نامپلی ۔ حیدرآباد ۔ انڈیا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

الحمد لله رب العالمین والصلوة والسلام علی سید الانبیاء و المرسلین و علی آله الطیبین و اصحابه الاکرمین اجعمین اما بعد

حضرت مولانا سید محمد شاہ قطب الدین حسینی صابری علیہ الرحمہ حیدر آباد کے مشائخ کبار اور سجادہ نشین ہونے کے ساتھ ساتھ علوم متداولہ سے گہرا شغف رکھتے تھے خصوصاً قران مجید سے بہت زیادہ دلچسپی تھی۔ آپ نے اپنے زمانہ کے ممتاز علماء کرام سے علم حاصل کیا۔ اچھی صحبتیں پائیں ۔آپ کا علمی حلقہ بڑاوسیع تھا۔ہمیشہ قرآن مجید اوراس کی تفسیر و تشریح سے متعلق گفتگو و بحث ہوا کرتی احقر کو بھی جب کبھی ملاقات کا موقع ہوا اس وقت تفسیر سے متعلق زیادہ وقت موضوع بحث رہتا۔ آپ نے اخلاقیات سے آیات کو علحدہ جمع کیا اوراس کی تفسیر کے ساتھ مکمل کتاب مرتب کی ۔اسی طرح زیر نظر رسالہ تفسیر سورہ فاتحہ بھی آپ کی علمی کاوشوں کا ایک بہترین نمونہ ہے۔یوں تو سورہ فاتحہ کی ہر زمانہ میں ہر زبان میں بیشتر تفاسیر شائع ہوئی ہیں اتنی کثرت کے باوجود اس کی تفسیر کا سلسلہ تمام نہیں ہوا۔ یہی اس سورہ مبارکہ کی صداقت و کمال کی دلیل ہے۔ مولانا موصوف نے اپنی تفسیر میں عقائد احکام اور موجودہ زمانہ کے سائنسی ارتقاء کو پیش نظر رکھا ہے۔ نہایت سادے انداز میں اظہار خیال کیا ہے تا کہ قاری کو کسی قسم کی دشواری نہ ہو ۔استدلال بھی دلنشین ہے مخالف بھی پڑھے تو متاثر ہو جائے ۔ متقدمین اور متاخرین کے اقوال کو یکجا جمع کیا ہے جس سے پڑھنے والنے کو ہر زمانہ کے انداز اور حالات کا صحیح تجزیہ کرنے میں مدد ملتی ہے۔اس سورہ کی تفسیر کے تحت اہل سنت والجماعت کے عقائد

توسل و استعانت سے بھی آپ نے بحث کی ہے۔ تعبد و توسل کے فرق کو واضح کیا ہے اور یہ بتلایا ہے کہ نقطہ ضلالت کیا ہے۔ نیز آپ نے اللہ تعالی کی صفات الوہیت رحمٰن اور مالکیت کے ذریعہ دیگر مذاہب عالم کا ابطال باحسن الوجوہ کیا ہے۔ اس کی اور خصوصیات خود قاری دوران مطالعہ محسوس کرے۔ یہ تفسیر حقائق پر مبنی ہے۔ اس کے مطالعہ سے علم میں اضافہ اور عقیدہ میں پختگی آئے گی۔

میں آپ کے فرزند اکبر مولانا سید علی اکبر نظام الدین حسینی صابری صاحب سجادہ نشین حال کو مبارکباد دیتا ہوں کہ انھوں نے اپنے اسلاف کے علمی کاوشوں کو منصۂ شہود پر لانے کا عزم کیا ہے۔ اور متعدد کتابیں شائع کی ہیں۔ یہ رسالہ بھی اسی کا ایک جزء ہے دعا ہے کہ اللہ تعالی اس کو قبول عام عطا فرمائے۔

آمین بجاہ سید الانبیاء والمرسلین صلی اللہ علیہ و الہ و صحبہ اجمعین .

فقط

(مولانا) مفتی خلیل احمد

شیخ الجامعہ ' جامعہ نظامیہ حیدرآباد

ورکن آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الفاتحہ

۱۔نام: اس سورۃ کا نام "الفاتحہ" ہے۔فاتحہ یعنی جس سے کسی چیز کا افتتاح ہو۔اسطرح اسکی حیثیت قرآن پاک کے دیباچہ کی سی ہے۔اسکے اور بہت سے نام ہیں جن میں زیادہ مشہور ہیں۔(۱) ام القرآن کیونکہ اس میں سب علوم قرآن جمع ہیں۔(۲) تعلیم المسئلہ کیونکہ اللہ نے بندوں کو اس میں سوال کرنا سکھایا ہے۔(۴) سبع المثانی کیونکہ اسکی سات آیات ہیں اور ہر نماز میں بار بار پڑھی جاتی ہیں۔اسی طرح (۵) کنز (۶) کافیہ شافیہ اور (۷) اساس بلحاظ صفات بھی بولے جاتے ہیں جس سے اس سورۃ کی فضیلت اور عظمت کا پتہ چلتا ہے۔عوام میں اسکو اکثر (۸) الحمد بھی کہا جاتا ہے کیونکہ اس میں خدا کی حمد ہے۔

۲۔زمانہ نزول: یہ سورۃ بالکل ابتدائی زمانے کی ہے۔اگرچیکہ سورۃ علق ومزمل ومدثر کی بعض آیتوں کو باعتبار نزول سبقت حاصل ہے مگر سب سے پہلی سورۃ جو مکمل نازل ہوئی ہے وہ سورۃ فاتحہ ہے

۳۔مضمون: سورۃ فاتحہ قرآن پاک کا ایک اجمال ہے۔اسکے علاوہ عالم تصور وحالت دعا میں ان کا خدا سے تعلق ظاہر کرنے کیلئے اس میں عبرت انگیز لطیف پیرایہ اور معنی خیز الفاظ اختیار کئے گئے ہیں روحانی محویت میں سب سے پہلے حمد وثناء کے الفاظ ہی زبان پر آتے ہیں اور یہ حمد وثناء خلوص دل کے ساتھ ہو تو خدا کی مرضی سے ہم دوش ہو کر سکون وسلامتی پیدا کرتی اور برائی اور سرکشی کو دور کرتی ہے۔جب چشم بصیرت کے سامنے صفات خداوندی کا تصور آنے لگتا ہے تو پرستش اور محبت کے جذبات سے دل لبریز اور تمنائے ہدایت سے معمور ہو جاتا ہے۔ان کیفیات کے پیدا کرنے کے بعد تلاوت قرآن کی جائے تو اسکی تعلیمات سے حقیقی طور پر استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ارشاد نبوی (لا صلوۃ الا بفاتحۃ الکتاب) کے تحت

نماز کی ہر رکعت میں ضم سورہ سے قبل سورۃ فاتحہ پڑھی جاتی ہے۔ اس سے سورۃ فاتحہ کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے۔

خدا ہماری حمد وثناء کا محتاج نہیں کیونکہ اسکی ذات اس سے بہت ارفع واعلی ہے۔ درخواست کرنے کی بھی اسکے آگے بندہ کو ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ وہ اپنے بندوں کی ہر ضرورت کو خود بندوں سے زیادہ جانتا ہے اور بلا مانگے اسکا فضل واحسان نیک اور بد سب کو یکساں جاری ہے۔ دعاء سے ہماری ہی روحانی تربیت اور اطمینان اور سکون قلب مقصود ہے۔ اس لئے اس سورہ میں ہم کو صحیح طریقہ سے خدا کے حضور میں دعاء کرنے کا طریقہ سکھایا گیا ہے۔ اور قرآن پاک کی ابتداء میں اس سورے کو رکھ کر یہ تعلیم دی گئی ہے کہ قرآن پاک کی تلاوت کرتے وقت یہ زینت کا ذریعہ ایسے کہ راہ حق کی جستجو میں طالب حق رہنمائی کا جویا ہے۔ اسی وقت قرآن پاک ان کے حق میں سرچشمہ ہدایت واصلاح ہو سکتا ہے اور وہ اپنی زندگی کو اس ضابطہ حیات پر ڈھال سکتا ہے جس کا نام قرآن ہے

اعوذ بالله من الشیطان الرجیم (ترجمہ)۱۔ پناہ مانگتا ہوں میں اللہ سے شیطان مردود کے خلاف ۔

۱۔ قرآن ک کے سورۃ نحل آیت ۹۸ میں ارشاد باری ہے ﴿ **فاذا قرات القرآن فاستعذ بالله من الشیطن الرجیم** ﴾ یعنی جب تم قرآن پڑھو تو شیطان مردود کے خلاف اللہ کی پناہ حاصل کرو) اس حکم کی تعمیل میں جب قرآن کی تلاوت شروع کی جاتی ہے تو تعوذ پڑھا جاتا ہے اور سب سے مشہور استعاذہ " **اعوذ بالله من الشیطان الرجیم** " ہے شیطان سے مراد وہ ناری مخلوق ہے جس کا تعلق جنس جن سے ہے (اسکی مزید تشریح سورۃ بقرۃ کی آیتوں میں ملیگی) نہ صرف یہاں وہی مراد ہے بلکہ انسان کا نفس امارہ جو انسان کو بھٹکاتا ہے

اور اسکے خیالات میں پراگندگی پیدا کرتا ہے وہ بھی انسان کا اندرونی شیطان ہے ﴿شیٰطین الانس والجن﴾ (انعام ع ۱۴) اندرونی اور بیرونی ہر دو نوعیت کے شیاطین سے محفوظ رہنے کیلئے اللہ کی پناہ مانگی جاتی ہے۔ صرف اتنا ہی نہیں کہ زبان سے یہ کلمہ کہدیا جائے بلکہ اسکے ساتھ دل میں یہ خواہش اور عملاً یہ کوشش بھی ہونی چاہیے۔ کہ آدمی قرآن پڑھتے وقت شیطان کے گمراہ کن وسوسوں سے خود کو محفوظ رکھے۔ یعنی ان احکام قرآنی کے پڑھتے وقت اور عمل کرتے وقت انسان یکسو رہے۔ اور اسکو ارتکاز دماغی حاصل ہو۔ چنانچہ ارشاد ربانی ہے ﴿واذا قری القرآن فاستمعوا له وانصتوا لعلکم ترحمون﴾ (اعراف ع ۲۴) یعنی جب قرآن پڑہا جائے تو اس پر کان لگائے رہو اور خاموشی اختیار کرو اور اسی کی طرف دھیان رکھو تاکہ تم مستحق رحمت بنو)۔

تعوذ پڑھ کر انسان سارے ملعونات اور پراگندیوں سے اپنے آپ کو محفوظ کرلیتا ہے۔ اسی لئے قرآن پاک کی تلاوت شروع کرنے اور اسکے معانی اور مطالب سمجھنے سے پہلے تعوذ سے اس کتاب کو شروع کیا جاتا ہے۔

(۱) بسم الله الرحمن الرحيم (ترجمہ) ۲۔ اللہ کے نام سے (شروع کرتا ہوں) جو بے حد شفقت والا نہایت رحم والا ہے

۲۔ بعض علماء آیت بسم اللہ کو سورۃ فاتحہ کا جز بتلاتے ہیں اور انکا استدلال (ولقد اٰتیناك سبعا من المثاني والقرآن العظيم (الحجر ع ۶) یعنی ہم نے تم پر نازل کیں سات آیتیں اور قرآن بزرگ) کی طرف ہے کے جب تک سورۃ فاتحہ کا جز اس آیت کو قرار نہ دیا جائے سورۃ فاتحہ کی سات آیتوں کی تکمیل نہیں ہوتی۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ یہ آیت جز قرآن تو ہے مگر کسی سورت کا جز نہیں بلکہ جداگانہ آیت ہے اور ہر سورت کی ابتداء میں تبرکا لکھی اور پڑھی جاتی ہے اور اس لئے بھی کہ ہر سورت میں فصل رہے۔ بعض علماء اس خیال

کے بھی حامل ہیں کہ ہر جگہ یہ آیت تبرکاً پڑھی جاتی ہے اور دراصل سورہ نحل کا جز ہے ﴿انه من سليمان و انه بسم الله الرحمٰن الرحيم﴾ یعنی وہ (خط) سلیمان کی جانب سے ہے اور اس کا آغاز اللہ کے نام سے کیا جاتا ہے جو بے حد شفقت والا نہایت مہربان ہے) بہر حال یہ آیت قران کریم کی ایک مستقل آیت ہے جس طرح سورہ فاتحہ کل قران کریم کا خلاصہ ہے اس طرح سورہ فاتحہ کا خلاصہ بسم اللہ الرحمن الرحیم ہے۔

اللہ۔ یہ باری تعالی کا اسم ذات ہے اور کل اسماء الٰہی کیلئے یہ اسم جامع ہے۔ یہ کسی سے مشتق نہیں ہے نہ اس کے مفہوم معانی کی صحیح ترجمانی کسی زبان کا کوئی لفظ کر سکتا ہے۔

الرحمن الرحیم۔ یہ دونوں اسماء "رحم" سے مشتق مبالغے کے صیغے ہیں۔ رحمٰن وہ ذات ہے جو مخلوق کی پیدائش سے پہلے اس کے لئے تمام اسباب اکٹھا کرتا ہے (اذا اراد الله شيئا هيا اسبابه) اور اس صفت کا ظہور مومن کافر سب کیلئے یکساں ہوتا ہے۔ اور رحیم وہ ذات ہے جو انسان کے اعمال پر احکام مرتب فرمانے والا ہے۔

---

(۲) ﴿الحمد لله رب العالمين﴾ (ترجمہ) ساری ستائش اس خدا کیلئے ہے جو سارے جہانوں کا پالنے والا ہے۔

﴿ الرحمن علم القران ﴾ (رحمٰن ع ۱) شرائع کا دینا نبوت کا عطا کرنا صفت رحمانیت کا اقتضاء ہے ان شرائع پر عمل کر کے فلاح حاصل کرنا رحمیت کے تحت ہے۔ اس لئے ان دونوں صفات کے لحاظ سے ارشاد ہوا ﴿تنزيل من الرحمن الرحيم﴾ (حم سجدہ ع ۱) ﴿ هو الذی ینزل علی عبده ایت بینٰت لیخرجکم من الظلمٰت الی النور . وان الله بكم لرء وف رحيم﴾ (الحدید ع ۱) یعنی اللہ رحمن الرحیم کی جانب سے (قران) کا نزول ہوا ہے۔ یعنی قران اپنے احکام و شرع کے لحاظ سے ہدایت میں بدرجہ کمال کرتا ہے اور اس پر بھی عمل کرنے کا فلاح بھی بدرجہ کمال حاصل ہوتا ہے۔ لفظ

رحمن اللہ سے مخصوص ہے غیر اللہ پر استعمال نہیں ہوتا اور ”رحیم“ عام ہے غیر اللہ پر بھی بولا جاتا ہے۔ جیسے ﴿بالمومنین رء وف الرحیم﴾ آنحضرت ﷺ کے لئے آیا ہے بسم اللہ اور سورہ فاتحہ۔ آیت بسم اللہ الرحمن سورہ فاتحہ کا خلاصہ ہے۔ سورہ فاتحہ میں جن چار صفات الٰہی (۱) رب (۲) رحمٰن (۳) رحیم (۴) مالک کا ذکر ہے ان میں سے یہاں دو کا انتخاب کیا گیا ہے۔ وہاں ربوبیت' رحمانیت' رحیمیت اور مالکیت کے چار امہاۃ الصفات ہیں۔ یہاں ان میں سے دو صفات رحمانیت ورحمیت کا انتخاب ہوا ہے۔ غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ سامانوں کا مہیا کرنا اور جب ان سامانوں کو کام میں لایا جائے تو اس پر اجر کا مترتب ہونا یہی نظام عالم ہے۔ نظام جسمانی اور نظام روحانی دونوں کا قیام ان ہی دو صفات سے ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ کے اسم اعظم ﴿اللہ الرحمن الرحیم﴾ قرار دیا گیا ہے۔ باقی نصف حصہ جو استعانت کے لئے رکھا گیا ہے۔ آیت بسم اللہ مسلمان کی زندگی میں عملی توحید کا سبق ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے (کل أمر ذی بال لم یبدأ فیہ بسم اللہ فھو اقطع او اجذم) یعنی ہر اچھا کام جو اللہ کے نام سے نہ شروع کیا جائے وہ دم بریدہ یعنی ناقص ہوتا ہے) ۔

حمد کا مفہوم۔ تعریف کہتے ہیں کسی چیز کے اوصاف کو اس طرح بیان کرنا کہ جس سے وہ ظرف پہچان میں آجائے۔ خدائے تعالیٰ کے اوصاف کو کماحقہ بیان کرنا انسان کی مقدرت سے بالاتر ہے ”افصح العرب والعجم“ ہونے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا“ ما عرفناك حق معرفتك“ یعنی اے پروردگار ہم تجھ کو ایسا نہ جان سکے جو بڑے شایان شان ہے) اور فرمایا“ انت کما اثنیت علی نفسك“ تو ایسا ہی ہے جیسا کہ تو نے خود اپنے متعلق آپ بیان فرمایا ہے)۔

یہاں ”حمد“ سے مراد تعریف نہیں بلکہ اعتراف ہے یعنی کائنات کو رنگارنگی اور مخلوقات

کے انواع واقسام کو دیکھ کر موجودات کی افادیت کو جان کر ہر مخلوق میں جو خوبی رکھی گئی اس کو سمجھ کر کسی چیز کی غایت آفرینش کا احساس کر کے جب انسان بے تحاشہ یہ کہہ اٹھے ﴿صنع الله الذی اتقن کل شئی﴾ (النمل ع ٧) یعنی اللہ کی صنعت کہ ہر چیز ٹھیک ٹھیک رکھا۔ تو اس اعتراف کو ہی حمد کہا جائے گا۔ اور جب موجودات کی افادیت کا انسان اعتراف کرتے ہوئے اس کو خالق کی طرف منسوب کرے تو وہی بندہ فرماں بردار کہلائے گا۔ ﴿وما خلقنا السماء والارض و ما بینهما باطلاً . ذالك ظن الذین کفروا﴾ (ص ع ٣) یعنی ہم نے زمین و آسماں اور ان میں جو بھی ہے کسی چیز کو بھی بے مقصد نہیں بنایا جب کہ کافر سمجھتے ہیں جو کہ خدا کی ہستی سے انکار ہے اور ﴿لا تحسبن الذین یفرحون بما اتوا و یحبون ان یحمدوا بما لم یفعلوا فلا تحسبنهم بمفازة من العذاب ولهم عذاب الیم﴾ (آل عمران ع ١٩) یعنی جو لوگ اپنے کئے پر خوش ہوتے ہیں اور جو بن کئے اپنی تعریفات کے طالب ہوتے ہیں تو یہ نہ سمجھو کہ ایسے لوگوں کو عذاب سے چھٹکارہ مل جائے گا۔ وہ دردناک عذاب میں مبتلاء ہوں گے) مطلب یہ ہے کہ اگر بن کئے اپنی ستائش چاہتے ہیں یا کچھ شیخی معمولی کام کر کے اپنے آپ کو مستحق ستائش سمجھ لیتے ہیں حالانکہ حقیقت میں سب کرنے والا خالق کائنات ہے جس نے ہر چیز میں مناسب صلاحیت رکھی اس لئے وہی ساری ستائش کا مستحق ہے کیونکہ ﴿و لله ملك السمٰوٰت والارض والله علی کل شئی قدیر . ان فی خلق السمٰوٰت والارض و اختلاف الیل و النهار لاٰیٰت لاولی الالباب﴾ (آل عمران ع ١٩۔ ٢٠٠) یعنی زمین و آسماں میں ہر چیز خدا کے لئے ہے جو ہر چیز پر قادر ہے۔ زمیں و آسماں کے اندر اور رات اور دن کے بدلنے میں سمجھنے والوں کیلئے مقام فکر ہے۔ ﴿خلق الله السمٰوٰت والارض بالحق . ان فی ذٰلك لاٰیة للمؤمنین﴾ (عنکبوت ع ٤) یعنی زمین و آسماں کو اللہ نے بالکل درست پیدا کیا۔

مومنوں کیلئے اس میں قابل غور نکات ہیں)
جو انسان بن کچھ کئے اپنی تعریف چاہتا ہے اور اپنے کئے پر فخر کرتا ہے اور خالق حقیقی کو بھلا دیتا ہے۔ اور جو انسان زمین و آسماں اور کائنات اور موجودات پر غور کر کے خالق حقیقی کی صفت کو سمجھ کر اس کا اعتراف کرے تو وہی انسان بندہ (فرمانبردار) ہے۔ ﴿الذین یذکرون اللہ قیاما و قعودا و علی جنوبھم و یتفکرون فی خلق السمٰوٰت والارض ربنا ما خلقت ھذا باطلاً سبحنك فقنا عذاب النار﴾ (آل عمران ع ۲۰)
یعنی جو بن سمجھے نہیں بلکہ غور و فکر کر کے سمجھ کر کائنات اور مخلوقات پر غور کر کے اس قادر مطلق کا اعتراف کرے اور زندگی کے ہر پہلو پر محسن اعظم کو یاد کرے) اس اعتراف ہی کا نام حمد ہے اور ان احساسات کا نام ایمان اور حب خالق کائنات کو نظر انداز کیا جاتا ہے اور مخلوق ہی کو سب کچھ سمجھ لیا جاتا ہے یا ایک مخلوق کی افادیت کو عقلی طور پر اس مخلوق کی طرف منسوب کر کے خالق کے کمال کو نظر انداز کر دیا جائے ۔ تو اس کا نام کفر ہے۔
﴿ولئِن سالتھم من نزل من السماء ماءً فاحیا بہ الارض من بعد موتھا لیقولن اللہ قل الحمد للہ بل اکثرھم لا یعقلون﴾ (عنکبوت) یعنی اگر تم ان سے دریافت کرو کہ کس نے آسماں سے بارش برسا کر زمین کو اس سے زندہ کیا تو کہیں گے کہ اللہ نے کیا تم کہو کہ ساری حمد اللہ کی ہے لیکن ان میں اکثر نا سمجھ ہیں) ۔
﴿و سخرلکم ما فی السمٰوٰت و ما فی الارض جمیعاً منہ ان فی ذٰلك لاٰیٰت لقوم یتفکرون﴾ (الجاثیہ ع ۲) یعنی ہم نے تمہارے لئے زمین اور آسماں (ساری کائنات) کو مسخر کیا جو لوگ غور و فکر کرنے والے ہیں ان کے لئے اس میں کافی علامات ہیں) مثال کے طور پر ایک بات یہاں بیان کی جائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔ جہاں موجودات پر غور کر کے خدا کی قدرت کا احساس کرنے کیلئے متعدد مقامات پر مختلف پیرایوں میں قران نے تاکید

فرمائی ہے وہاں خصوصیت کے ساتھ (سورہ سباع ۲ میں بیان فرمایا ہے۔﴿و لقد اٰتینا داوّد منا فضلاً﴾ اور فرمایا ﴿ والنا له الحديد ان اعمل سٰبغٰت و قدر فی السرد . واعملوا صالحاً انی بما تعملون بصیر﴾ یعنی ہم نے داود کو ایک امتیازی حیثیت عطا فرمائی اور ہم نے ان کے لئے لوہے کو پگھلا دیا تاکہ بنائیں اس سے زرہ بکتر ایک پیمانے کی کڑیاں جوڑ کر اور بھلے کام کیا کریں جو تم کرتے رہو گے میں اس پر نگرانی رکھونگا) اسی رکوع میں یہ بھی ارشاد ہوا ہے ﴿یعملون له ما یشاء من محاریب و تماثیل و جفان کالجواب و قد ورٍرّسیٰت اعملوا اٰل داود شکرا﴾ یعنی اس سے ان کے لئے قلعے، مورتیں اور لگن دیگیں وغیرہ تیار کرتے تھے (اور ہدایت ہوئی) اے آل داود اللہ کی شکر گذاری کے ساتھ (کائنات میں) رہو اسی طرح سے سورہ حدید رکوع ۳ میں ارشاد ہوا ﴿و انزلنا الحدید فیه باس شدید و منافع للناس و لیعلم الله من ینصره﴾ یعنی ہم نے لوہے کو پیدا کیا جس میں بنی نوع انسان کیلئے منفعت بھی ہے اور سخت نقصان بھی ہے تاکہ یہ معلوم رہے کہ کون اللہ اور اس کے رسولوں کی مدد کرتا ہے) یعنی احکام کی تعمیل اور اس کے نفاذ میں اس کو نیک اغراض کے تحت استعمال کرتا ہے۔ لوہے کو کس طرح اپنی ضروریات پر استعمال کیا جائے یہ سکھلا دیا گیا۔ نیک اغراض پر استعمال کرنے کی شرط لگائی گئی اس نئے فن کی تعلیم پر اللہ کے شکر گذار رہنے کی ہدایت کی گئی اور واضح کر دیا گیا کہ لوہے میں منافع بھی ہے اور مضرات بھی تاکہ احتیاط سے اور بھلے اغراض پر اس کا استعمال کیا جائے۔﴿و لقداٰتینا داود وسلیمٰن علما . و قالا الحمد لله الذی فضلنا علی کثیر من عباده المؤمنین﴾ (النمل ع ۲) یعنی داود اور سلیمان کو ہم نے ایک خاص علم و ہنر عطا کیا۔ دونوں نے کہا کہ اللہ تعالی جس نے ہم کو اپنے بہت سے مطیع بندوں پر بھی فضیلت عطا کی۔

پچھلے لوگوں کے علم الاشیاء سے متعلق معلومات محدود تھے۔ مگر جس کام پر بھی ان کو استعمال کرتے تھے وہ اغراض بھلے ہی ہوتے تھے۔ اس لئے ان کی نیکیاں زیادہ ہوتی تھیں۔ مادر علوم سے متعلق معلومات محدود۔ موجودہ زمانے میں سائنس کی تحقیقات کی وجہ سے لوہے کے استعمال کا علم وسیع ہوچکا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ غلط اغراض پر اس کا استعمال بھی وسیع تر ہوچکا ہے۔ اس لئے ہمارے علم کی وسعت کے ساتھ برائیوں کا دائرہ بھی وسیع تر ہو گیا ہے۔ اگر ہم اپنی وسعت علم کے ساتھ اپنی ایجادات کو بھلے اغراض پر استعمال کریں جیسا کہ اس فن کے عطا کرتے وقت خالق نے ہدایت فرمائی تھی تو ہماری بھلائیاں پچھلے لوگوں کے مقابل وسیع تر ہوجائے گی پچھلے لوگ "جز ولا یتجزا" کے وجود ہی سے متعلق جھگڑتے رہے تھے اور آج ایٹم کے کرشمے ہم پر ظاہر ہوچکے ہیں جس پروردگار نے ایک معمولی ایٹم میں یہ قوت رکھی ہے اگر اس خالق کی قدرت اور کمال کا احساس بھی ہم میں پیدا ہوجائے تو اس ایٹمی قوت اور کیفیت کا ایمان بھی ہمارے اندر پیدا ہوگا۔ اور اسی قوت اور وسعت سے ہم نیک اغراض پر خالق کے حکم کے تحت ہم اپنی ایجادات کو استعمال کریں گے۔ اس وقت ہمارے ایمان اور عمل صالح کی کیا قوت ہوگی قابل غور ہے۔

نوٹ: یہ قران کا بے مثل اعجاز ہے کہ آج دریافت (یعنے ایٹم) پر فخر و ناز کیا جارہا ہے۔ قران عظیم نے آج سے تقریباً چودہ سو سال قبل اس کی نشان دہی فرمادی تھی ﴿وکل شئی عندہ بمقدار﴾۔۳۹۸ (الرعدع۲) اس طرح یہ ایٹم "مقدر" کے سوا اور کیا ہے؟ تلاش و جستجو سے اس قسم کی آیتیں اور بھی دستیاب ہوسکتی ہیں ﴿خلق کل شئی فقدرہ تقدیرا ﴾ (۵۷۴) ﴿انا کل شیئی خلقنٰہ بقدر﴾ (۱۴۹ القمرع۳) ﴿قد جعل اللہ لکل شئی قدرا﴾ (۸۹۱ الطلاق ع۱)

یہ تو داود کو لوہے کے استعمالات کا جدید فن سکھانے اور اس پر خدا کے معترف ہونے کا بیان ہوا۔ اب جہاز رانی کے فن کا حال سنیئے۔ نوح علیہ السلام کو حکم ہوا ﴿ و اصنع الفلك باعيننا و وحينا ﴾ (ہود ع ۴) یعنی کشتی ہماری نگرانی ہمارے ہدایات کے مطابق تیار کرو ﴿فاذا استويت انت و من معك على الفلك فقل الحمد لله الذى نجنا من القوم الظلمين﴾ (مومنون ع ۲) یعنی جب تم اور تمہارے ساتھی کشتی میں بیٹھ جاو تو اللہ کی حکمت اور قدرت کے معترف ہو جاؤ کہ جس نے تمکو ظالموں سے اسطرح نجات دلائی) المختصر حمد سے مراد اعتراف ہے ﴿(له الحمد فى الاولى والاخرة﴾ (القصص ع ۷) حمد اول اور آخر سب اسی کی ستائش ہے) یہ ہے قرانی تہذیب موجودہ تہذیب میں سوائے خدا اور نیک مقاصد کے سب کچھ ہے جس کا خمیازہ انسانیت بھگت رہی ہے۔

" الحمد " پر الف لام استغراقی ہونے کی وجہ سے اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ساری حمد کا سزاوار خدا تعالی ہی ہے۔ تو کیا اس کا مقصد یہ ہو گا کہ خدا کے سواء کوئی دوسرا تعریف کا مستحق ہی نہیں۔ کوئی احسان مند اپنے محسن کی تعریف کرے تو کیا وہ شرک اور ناجائز قرار پائے گی۔ ایسا ہو گا تو پھر (من لم يشكر الله لم يشكر الناس جو انسان کا شکر گذار نہ بنے وہ خدا کا بھی شکر گذار نہیں ہو سکتا) حدیث بالا کی ہدایت پر عمل کس طرح ہو گا۔ اور احسان فراموشی کس طرح روا ہو جائے گی۔ بات در اصل یہ ہے کہ خدائے تعالی کی حمد حقیقت پر محول رہے گی۔ اور وہی خالق جو مخلوق میں صلاحیتیں بخشتا ہے ﴿يخلق ما يشاء ﴾ (قصص ع ۷) یعنی اللہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے) اور ﴿والله خلقكم و ما تعملون﴾ صفات ع ۳) یعنی اللہ نے تم کو بھی پیدا کیا اور تمہارے اعمال (یعنی صلاحیتوں) کو بھی محسن کے اندر احسان کی صلاحیت بھی اس کی ودیعت کردہ ہے اس لئے ممنون احسان جب محسن کی تعریف کرے گا تو محسن کی تعریف مجازاً رہے گی۔ اور حقیقت میں اس صلاحیت کے عطا

کرنے والے کے کمال کا اعتراف ہوگا۔ چونکہ حق تعالیٰ جن وانس وملکوت غرض سب عوالم کا پروردگار ہے اس لئے عوالم کے جملہ مخلوق اس کی تحمید اور تقدیس میں رطب اللسان ہے ﴿وان من شئی الا یسبح بحمدہ﴾ (بنی اسرائیل ع ۵) یعنی کوئی چیز دنیا میں ایسی نہیں جو اس کی حمد ادا نہ کرتی ہو)اور اس کائنات کا مالک جس نے کائنات کو اپنی مہربانی سے عدم سے وجود میں لایا کائنات کو بنانے کے بعد وہ کائنات سے بے تعلق بیٹھا نہیں ہے بلکہ کائنات کی بقاء کا دارومدار اسی کے رحم وکرم پر ہے۔ دنیا اور آخرت سب اس کے رحم کے محتاج ہیں۔ کیونکہ وہ رحمٰن الرحیم ہے جیسا کہ عبداللہ ابن مسعود سے روایت ہے کہ " رحمن الدنیا و رحیم الاخرۃ "

مختصر یہ کہ الحمد رب العالمین یعنی حمد وشکر عبادت ومعبودیت کی مستحق وسزاوار وہی ذات ہوسکتی ہے جس کو کائنات کی ہر شئی انسان حیوان شجر وحجر غرض کائنات کے ہر ذرہ سے یکساں تعلق اور مشترک نسبت ہو اور یہ حیثیت بجز خالق کائنات کے کسی کو حاصل نہیں ہوسکتی۔ ﴿خالق کل شئی فاعبدوہ وھو علیٰ کل شئی وکیل﴾ (انعام ع ۱۳) یعنی ہر چیز کو اس نے پیدا کیا لہذا اس کی عبادت کرو وہ ہر چیز کا کارساز ہے)۔

" رب العالمین "اسلام کی تعلیم کی وسعت پر دلالت کرتا ہے کہ جس کا منبع ایسی ہستی ہے جو تمام جہانوں کی ربوبیت ہوتی ہے نہ کہ ایک قوم کی "تنزیل من رب العالمین" دیگر یہ کہ ازمنہ سابقہ میں نسل انسانی کی روحانی ربوبیت متفرق طور پر ہوتی رہی تھی مگر اب ان سب کی ربوبیت وتربیت ایک ہی نبی کے ذریعہ سے ہوگی۔ اس سے تعلیمات اسلامی کی عالمگیر حیثیت ظاہر ہوتی ہے۔" ان ھوا الا ذکر اللعٰلمین " (ص ع ۵) پھر رب العالمین میں وحی الٰہی کی ضرورت کی طرف بھی اشارہ ہے کیونکہ اسم "رب" کا تقاضا ہے کہ وہ ہر مخلوق کو اپنے کمال کو پہنچائے۔ انسان کا حقیقی کمال جسم کی پرورش تک محدود نہیں ہے

بلکہ اخلاق کی تکمیل بھی ضروری ہے۔ جس طرح جسم کے کمال کے لئے عالم جسمانی میں خارجی سامان رب نے پیدا کئے ہیں ضروری ہے کہ روحانی کمال حاصل کرنے کیلئے بھی خارجی سامان مہیا ہوں۔ یہی وحی الٰہی ہے۔ یہ بھی یاد رکھنے کی بات ہے کہ جہاں بعض مذاہب نے خدا تعالیٰ کو "رب" یعنی باپ کہہ کر پکارا ہے قران کریم نے لفظ "رب" اختیار کیا ہے کیونکہ رب کا تعلق مخلوق سے اس سے کہیں بڑھ کر ہے جو باپ کا تعلق بیٹے سے ہے۔

"رب" کا لفظ عربی زبان میں تین معنوں میں بولا جاتا ہے۔ (۱) مالک اور آقا (۲) مربی۔ پرورش کرنے والا اور کمال کو پہچانے والا (۳) فرمانروا۔ حاکم، مدبر و منتظم۔ قران کریم میں ان سب معنوں میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔

حمد احمد۔ محمد۔ اس سورت کی ابتداء الحمد سے کر کے انسان کو رضا بالقضاء کا اعلیٰ ترین سبق سکھایا گیا ہے۔

---

(۳) الرحمن الرحیم (٤) مالك یوم الدین (ترجمہ) بے حد شفقت والا نہایت مہربان۔ یوم جزا کا مالک و مقتدر

کیونکہ اس سورت کو مسلمان دن میں پانچ نمازوں میں کئی کئی بار پڑھتے ہیں اور راحت و تکلیف دونوں حالتوں میں اس کے منہ سے حمد اور شکر ہی کے کلمات نکلتے ہیں۔ اس حمد بے پایاں کی بناء پر ہی آنحضرت کا نام "احمد" ہوا اور اللہ نے بھی مخلوق کی زبان سے سب سے بڑھ کر آپ کی تعریف کرائی اس لئے آپ "محمد" کہلائے۔ ﴿ان اللہ و ملئکته یصلون علی النبی یا ایھاالذین امنوا صلوا علیه وسلموا تسلیما﴾۔ الاحزاب ع ۷

۴۔ رحمٰن رحیم کی تشریح "بسم اللہ" کی تفسیر کے تحت گذر چکی ہے اس لئے وہاں اس کو ملاحظہ فرمالیجئے۔

۵۔ **ایمان بالآخرت**۔ حق تعالیٰ نہ صرف کائنات کو عدم سے وجود میں لایا بلکہ اب بھی

اس بقا میں ممد و معاون ہے۔ نہ صرف یہی کہ کائنات کو ایک نظام ایک اصول ایک فطرت کے تحت اپنے رحم و کرم سے چلا رہا ہے بلکہ منجملہ کائنات کے ایسی خصوصی مخلوق جو ذی شعور ہے ﴿وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون﴾ (الذاریات ع ۳) یعنی میں نے انسانوں اور جنوں کو صرف اپنی عبادت کیلئے پیدا کیا) اس کے لئے وقت بوقت حسب ضرورت و حسب حالات مناسب ہدایات اپنے لطف و کرم سے نازل فرماتا رہا۔ حاکم حکم دیدے مگر حکم کی تعمیل پر نگرانی نہ رکھے یا نگرانی رکھے مگر تعمیل پر جزا اور عدم تعمیل پر سزا نہ دے تو احکام کی اجرائی بے کار و بے معانی ہو جاتی ہے جیسے کہ آج کل کی صیانتی کونسل اقوام متحدہ کے فیصلے اور محکوم کو تعمیل حکم کی طرف مائل نہیں کر سکتی۔ اس لئے اس لازمی عقیدے کا یہاں درس دیا گیا کہ انسان مالک یوم جزا اور یوم سزا دونوں پر ایقان رکھے ورنہ اس عقیدے کے بغیر نہ محکوم احکام کی تعمیل کی طرف مائل ہو سکتا ہے اور نہ اپنی اس دنیاوی زندگی کو احکام کے سانچے میں ڈھال سکتا ہے اور نہ ہی زندگی کے حالات کو استوار کر سکتا ہے۔ اور اپنے خالق سے اپنی نسبت پیدا کر سکتا ہے چنانچہ ﴿فالذین لا یومنون بالاخرۃ قلوبھم منکرۃ و ھم مستکبرون﴾ (نحل ع ۳) یعنی جو لوگ یوم آخرت پر یقین نہیں رکھتے ان کے دل احکام الٰہی کی قبولیت سے منکر ہو جاتے ہیں اور ایسے لوگ احکام الٰہی کے آگے سر تسلیم خم نہیں کرتے) اور ﴿واستعینوا بالصبر والصلوۃ و انھا لکبیرۃ الا علی الخشعین الذین یظنون انھم ملقوا ربھم و انھم الیہ راجعون﴾ (بقرہ ع ۵) یعنی استقامت اور عزم کے ساتھ اور اپنے رب کی یاد تازہ کرتے ہوئے اپنے خالق سے اپنی زندگی کے ہر شعبہ میں ہر لمحہ مدد طلب کرو اگرچہ کہ بہت بھاری اور مشکل اور دشوار ہوتا ہے مگر جو لوگ اس پر یقین رکھتے ہیں کہ ایک دن اپنے مالک کو صورت دکھانا ہے تو ان کے لئے اپنی زندگیوں کو احکام الٰہی کے مطابق بنا لینا آسان ہوتا ہے تاکہ مالک کو

صورت دکھانے کے قابل خود کو بنالیں۔

مالک کا مفہوم۔ حاکم پابند قانون ہوتا ہے اور مالک پابند قانون نہیں ہوتا۔ مالک کا لفظ یہاں کلیۃً اسی قدرت مطلقہ کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ ﴿ یغفر لمن یشاء و یعذب من یشاء والله علی کل شئی قدیر ﴾ (بقرہ ع ۴۰) یعنی اللہ جس کو چاہئے بخش دے اور جس کو چاہئے عذاب دے۔ اللہ ہر چیز پر قادر ہے) مگر ارحم الراحمین کے رحم و کرم کا تقاضا یہ ہے کہ ﴿ من جاء بالحسنة فله عشر امثالها ﴾ (انعام ع ۲۰) یعنی ہر ایک شخص کو اس کی نیکی کے عوض دس گنا ثواب عطا کیا جائے گا) اور انصاف کا تقاضہ یہ کہ ﴿ ومن جاء بالسیئة فلا یجزی الا مثلها ﴾ ' (انعام ع ۲۰) یعنی بدکار کو اس کی بدی کی برابر سزا دی جائے گی۔

چار صفات الٰہی میں مذاہب عالم کے عقائد باطلہ کی تردید ۔ اس سورت میں اسطرح جو چار صفات الٰہی بیان ہوئے ہیں یعنی (۱) رب (۲) رحمٰن (۳) رحیم (۴) مالک اس کے روسے کل مذاہب عالم کے عقائد باطلہ کی تردید بھی ہوتی ہے۔ صفت ربوبیت میں بت پرستی اور ہر قسم کے شرک کی تردید ہے ۔ کیونکہ مستحق حمد و عبادت وہی ذات ہوسکتی ہے جو مربی ہو۔ صفت رحمانیت میں جس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بلا معاوضہ رحم کرتا ہے عیسائی عقیدہ کفارہ کی تردید ہے کیونکہ کفارے کے عقیدے کی بنیاد اس بات پر ہے کہ چونکہ اللہ رحم بلا معاوضہ نہیں کرسکتا اس لئے اس کا معصوم بیٹا انسانوں کے گناہوں کا معاوضہ بنایا گیا ۔ صفت رحمیت کا مفہوم یہ ہے کہ انسان کے اعمال پر جو اللہ کے احکام کی فرمانبرداری میں ہوں بڑے بڑے اجر ملتے ہیں اس کے تحت ایسے عقائد کی تردید ہے جو انسان کے اعمال کے محدود ہونے کی وجہ سے ان کے اجر کو بھی محدود قرار دیتے ہیں اور جس وجہ نجات بھی عارضی قرار دی جاتی ہے۔ جیسا کہ بدھ مذہب صفت

مالکیت میں اللہ کا تعلق اپنے بندوں کے ساتھ ہے جیسا کہ مالک کا اس کی ملک کے ساتھ ہوتا ہے۔ خواہ انصاف کرے خواہ بخش دے اور اس لئے عقیدہ تناسخ کی اس میں تردید ہے جس کی رو سے اللہ تعالیٰ کوئی گناہ معاف نہیں کر سکتا بلکہ ہر گناہ کی پاداش میں انسان کو بے شمار گونوں سے گذرنا پڑتا ہے۔

(۵) ایاك نعبد و ایاك نستعین (ترجمہ) ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور صرف تجھ سے ہی مدد چاہتے ہیں۔

۵ معبود واحد۔ جس ہستی نے کائنات کو عدم سے وجود بخشا اور جس کے احسانات اور کرم مسلسل جاری ہیں ﴿و ان تعدوا نعمت اللہ لا تحصوھا ﴾ (ابراہیم ع ۵) یعنی اگر تم خدا کی نعمتوں کو گننا چاہو تو نہیں گن سکتے) اسی کی شکر گذاری اور اسی کی بندگی کی جائے گی۔ ﴿الا تعبدوا الا ایاہ﴾ (بنی اسرائیل ع ۳) یعنی صرف خدا کی ہی عبادت کرو) اور جو بن مانگے عدم سے وجود میں لایا اور جو بغیر استدعا کے ﴿و ما من دابة فی الارض الا علی اللہ رزقھا﴾ (ہود ع ۱) یعنی ہر جاندار کو رزق پہنچانا رزاق حقیقی کا کام ہے) ہر جاندار کو رزق پہنچا رہا ہے تو انسان جب کبھی استدعا کرے گا تو اسی ہستی کے طرف رجوع ہوگا جو خود بخود ازراہ کرم ربوبیت کی طرف مائل ہے ﴿فا بتغوا عند اللہ الرزق و اعبدوہ و اشکروا لہ ﴾ (عنکبوت ع ۲) یعنی اللہ ہی سے رزق مانگو اسی کی عبادت کرو اور اسی کا شکر ادا کرو۔

عبادت کا مفہوم ۔عبادت سے مراد ہے ﴿ان صلاتی و نسکی و محیای و مماتی للہ رب العلمین﴾ (انعام ع ۲۰) انسان یہ سمجھے کہ میری عبادتیں میرا ایثار میرا مرنا میرا جینا سب اللہ کے لئے ہے) یعنی انسان اپنی زندگی احکام خداوندی کے تحت گذارے تو اس کی صرف عبادت ہی عبادت نہیں بلکہ ہر ذاتی کام بھی عبادت میں شمار ہو جاتا ہے۔ اور عبادت کو ذاتی اغراض کے تحت کیا جائے تو بجائے ثواب کے گناہ کا موجب ہو جاتا ہے۔ چنانچہ

ارشاد ہوا ﴿فویل للمصلین الذین ہم عن صلاتھم ساھون الذین ہم یرآءون﴾ (ماعون) یعنی برا ہوان نمازیوں کا جو نماز کی ادائی میں تساہل و کاہلی برتتے ہیں اور جو دکھاوا کرتے ہیں اللہ کی ذات و صفات اور عبادت میں کسی کو شریک کرنا تو بڑی چیز ہے۔ اگر احکام الٰہی کو خواہ کسی شعبہ زندگی سے تعلق رکھتے ہوں پس پشت ڈال کر نفس کی خواہشات کی اتباع کریں تو بھی شرک ہے۔

شرک۔ ﴿ولا یشرك فی حکمه احدا﴾ (کہف ع ۴) یعنی اللہ کے حکم میں کسی کا دخل نہیں ﴿ولا تطع من اغفلنا قلبه عن ذکرنا و اتبع ہوٰہ﴾ (کہف ع ۴) یعنی اس شخص کی پیروی نہ کرو جو ہماری یاد کو بھلا دیا ہو اور اپنے خواہشات نفس کی پیروی میں پڑ گیا ہو) اور ﴿ا رأیت من اتخذا الیه ہوا ہ﴾ (فرقان ع ۴) یعنی کیا تو نے نہیں دیکھا اس شخص کو جس نے خواہشات نفس کو اپنا معبود بنالیا ہے۔ اور ﴿و من اضل ممن اتبع ہوٰہ بغیر ھدی من اللہ﴾ (قصص ع ۵) یعنی اس سے زیادہ اور کون گمراہ ہو سکتا ہے جو اپنی خواہشات نفس کا مطیع بن جائے اور اللہ کی ہدایت کو نظر انداز کر دے) عبادت کو انسان کی زندگی کی اصل قرار دیا گیا ﴿و ما خلقت الجن و الانس الا لیعبدون﴾ (الذاریات ع ۳) یعنی میں نے انسانوں اور جنوں کو صرف اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا) کیونکہ انسان اپنے کمال کو نہیں پہنچ سکتا جب تک کہ اپنی تمام قوی کو اللہ تعالیٰ کے تحت ہدایات مصروف نہ کر دے۔ عبادت انسان کی اپنی بہتری کے لئے ہے۔ اللہ کی ذات غنی ہے اس کو نہ کسی کی عبادت سے فائدہ پہنچتا ہے اور نہ عدم عبادت سے نقصان۔ اور جب تک انسان عبادت نہیں کرتا اور اپنے قوائی فطری کو اس کے منشاء کے بموجب کام میں نہیں لگاتا اس وقت تک وہ مدد کا مستحق بھی نہیں ہوتا۔ جو اپنی آپ مدد کرتا ہے تو خدا بھی اس کی مدد کرتا ہے" اس مفہوم کی طرف اشارہ ہے اور ﴿ ان اللہ لا یغیرو ما بقوم حتی یغیروا ما

بانفسهم (الرعد ع ۲) اللہ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب کہ وہ خود کی اصلاح نہ کرلیں)
خالق کے سوا دوسرے کی عبادت قطعاً ناجائز ہے اور نہ کسی غیر اللہ کو شریک عبادت کیا جاسکتا
ہے۔ کیونکہ اللہ خالق ہے اور اس کا غیر خواہ وہ کائنات کی کسی جنس سے بھی تعلق رکھتا ہو
مخلوق مجبور اور محتاج جو خود محتاج ہو تو دوسرے کی مدد کس طرح کرسکتا ہے۔ ﴿ایشرکون
مالا یخلق شیئاً و هم یخلقون و لا یستطیعون لهم نصراً و لا انفسهم ینصرون﴾
(اعراف ع ۲۴) کیا ایسے کو شریک بناتے ہیں جو کچھ بھی پیدا نہیں کرسکتے بلکہ وہ خود
مخلوق ہیں اور نہ وہ ان کی مدد کرسکتے ہیں اور نہ خود اپنی اس حکم الٰہی کا منشاء یہ ہے کہ خداوند
تعالیٰ کی ذات پاک کے سواء دوسروں کے سامنے حقیقت میں دست سوال دراز کرنا بالکل
ناجائز ہے۔

مقربین الٰہی کا توسل ۔ کسی مقبول بندے یا کسی مقرب بارگاہ ایزدی کو واسطہ یا وسیلہ
سمجھے تو اس کے منافی نہیں ہے؟ ﴿و قالوا حسبنا الله سیؤتینا الله من فضله و رسوله
انا الی الله راغبون﴾ (توبہ ع ۷) یعنی اور کہتے ہیں کہ اللہ ہمارے لئے بس ہے۔ اللہ
اپنے فضل سے اور اس کا رسول آئندہ بہت کچھ ہم کو دے گا۔ ہم تو اللہ کی طرف ہی رغبت
رکھنے والے ہیں۔ یعنی اللہ کو کافی حقیقی جاننا اور رسول کو واسطہ سمجھنا چاہئے اور ﴿ ومن
الاعراب من یؤمن بالله والیوم الاخر و یتخذ ما ینفق قربت عند الله و صلوٰت
الرسول .الا انها قربة بهم﴾ (توبہ ع ۱۲)۔ یعنی اور اپنی بدویوں میں سے کچھ لوگ ایسے
بھی ہیں جو اللہ اور روز آخر پر ایمان رکھتے ہیں اور وہ لوگ جو بھی خرچ کرتے ہیں اس کو
تقرب الٰہی کا ذریعہ سمجھتے ہیں اور رسول اللہ کی دعا حاصل کرنا چاہتے ہیں یقیناً ان کو تقرب
حاصل ہوگا۔ ان کے عمل کی افادیت اور اہمیت اپنی جگہ ہے مگر اس کے بعد بھی
رسول کی دعا کا حصول مطمع نظر رہا اور اس کے بعد ہی تقرب کا تیقن انہیں ملا۔

اور ﴿اولئك الذين يدعون يبتغون الىٰ ربهم الوسيلة ايهم اقرب و يرجون رحمته و يخافون عذابه﴾ (بنی اسرائیل ع ٦) یعنی یہ لوگ جن کو پکارتے ہیں (عیسیٰ' عزیر' موسیٰ)وہ خود اللہ تک کسی مقرب ترین بندہ کا وسیلہ ٹٹولتے ہیں جو اللہ کی رحمت کا متلاشی ہو اور اس کے عذاب سے خائف یعنی جن کو کافر پوجتے ہیں وہ آپ ہی اللہ کے جناب وسیلہ ڈھونڈتے ہیں کہ جو بندہ بہت مقرب ہو اس کا وسیلہ اختیار کریں (آخرت میں سب کا وسیلہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جو سب کی شفاعت فرمائیں گے)اور ﴿ فاما الذين آمنوا وعملوا الصٰلحٰت فيدخلهم ربهم فى رحمته ذٰلك هو الفوز المبين﴾ (جاثیہ ع ۴) یعنی اللہ کے نیک بندے ہی جوار رحمت میں جگہ پاتے ہیں اور اس کی رحمت میں داخل ہونا ہی ہدایتاً مراد پانا ہے ۔ اور ﴿ والذين اٰمنوا بالله و رسله اولئك هم الصديقون والشهدآء عند ربهم لهم اجرهم و نور هم﴾ (حدید ع ۲) یعنی جو لوگ کہ اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے وہ صدیقین سے ہیں اور اپنے رب کی پاس لوگوں کے احوال پیش کرتے ہیں۔ ان کو ان کے اعمال کا اجر ملے گا اور نور ایمان حاصل رہے گا۔ نور ایسی چیز ہے جس سے دوسروں کو بھی مستفیض کیا جائے گا۔ اور ﴿فاولئك مع الذين انعم الله عليهم من النبين و الصديقين والشهدآء والصٰلحين و حسن اولئك رفيقا ﴾ (النساء ع ۹) یعنی یہ لوگ ان کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے اپنا خاص رحم و کرم فرمایا ہے۔ یعنی نبی صدیق شہید اور صالح لوگوں کے ساتھ اور یہ اچھے ساتھی ہو اور ﴿و يستبشرون بالذين لم يلحقوا بهم من خلفهم ﴾ (آل عمران ع ۱۷) یعنی ان کی وجہ سے بھی خوش ہوتے ہیں جو ان سے نہیں ملے اور پیچھے رہ گئے۔ اس سے نیک ارواح کا اپنے پس ماندوں کے لئے نیک تمنا رکھنا ظاہر ہوتا ہے اور ﴿ يآيها الذين اٰمنوا اتقوا الله و ابتغوا اليه الوسيلة و جاهدوا فى سبيله لعلكم تفلحون﴾ (مائدہ ع ٦) یعنی اے ایمان والو اللہ سے ڈرو (یعنی

اس کی سزا کے خوف سے برائی سے محفوظ رہو) اور اس تک پہنچنے کیلئے وسیلہ اختیار کرو اور اس کے احکام کے تحت جہاد نفس کرو۔

مقربین الہی کی سفارش کی قبولیت ۔ جو لوگ مرضی مولی پر چلے مالک کسی بات کو نہ ٹالا دلی رغبت سے احکام الہی کی اطاعت کی (یعنی رضوعنہ بن گئے) تو ان کے نفس مطمئنہ کو "راضیۃ" کا خطاب عطا ہوا اور وہ مقربین اولیاء اللہ سے ہو گئے۔ اس مقام پر پہنچنے کے بعد ان کی استدعا التجا خواہش سفارش کو بھی اللہ تعالیٰ نہ ٹلے گا ان کو "رضی اللہ عنہ" (المائدہ ع آخر) کا شرف ملا اور ان کے نفس مطمنہ کو "مرضیۃ" کا لقب حاصل ہوا۔ یہ لوگ مستجاب الدعوات ہوئے۔ ﴿و یستجیب الذین امنوا وعلموا الصٰلحٰت و یزیدھم من فضلہ﴾ (شوری ع ۳) یعنی ایمان والوں اور نیک لوگوں کی دعا اللہ سنتا ہے اور اپنے فضل سے اور زیادہ عطا فرماتا ہے۔ نہ صرف ان کو ﴿الا ان اولیاء اللہ لا خوف علیھم ولاھم یحزنون﴾ (یونس ع ۷) یعنی یاد رکھو کہ جو لوگ اللہ کے دوست بن چکے ہیں ان کو کسی قسم کا ڈر یا خوف و غم نہ ہوگا اور ﴿تتنزل علیھم الملٰئکۃ الا تخافوا ولا تحزنوا﴾ (حم سجدہ ع ۴) فرشتے ان پر وقت بوقت نازل ہوتے رہتے ہیں تا کہ ان کے قلوب کو اطمینان پہنچاتے رہیں ان ارشادات سے نہ صرف انہیں مطمئن کیا گیا بلکہ ان کو اپنے دوست ہونے کا تیقن عطا فرمایا گیا اور خود ان کا دوست ہونے کا بھی یقین دلایا گیا ﴿نحن اولیٰؤکم فی الحیوۃ الدنیاو فی الاخرۃ﴾ (حم سجدہ ع ۴) یعنی ہم بھی اس زندگی اور آخرت دونوں میں تمہارے دوست ہیں اور ارشاد ہوا کہ ﴿ولکم فیھا ما تشتھی انفسکم ولکم فیھا ما تدعون﴾ (حم سجدہ ع ۴) یعنی تم جو چاہو گے ملیگا۔ منہ مانگی چیز تم کو دی جائے گی۔ ﴿لھم فیھا مایشآؤن خٰلدین کان علیٰ ربك وعداًمسئولا﴾ سورہ فرقان ع ۲) یعنی منہ مانگی چیز متقین کو ملے گی۔ اسی حیثیت میں ہمیشہ رہیں گے۔

بہتیرے رب کا وعدہ ہو چکا ہے۔

توسل اور تعبد کا امتیاز۔اس طرح حق تعالی نے خود کے مجیب الدعوات ہونے کا اعلان فرمایا اور مقربین اور اولیاء اللہ کو مستجاب الداعوت ہونے کا شرف بخشا۔اس لئے مقربین کا توسل قبولیت دعا کیلئے زیادہ یقینی ہوتا ہے کیونکہ ان کی زبان مقبول ہے۔ مگر توسل اور تعبد میں امتیاز ضروری ہے توسل کہہ کر تعبد مقصود رہے تو ایسا توسل قرب کا ذریعہ بننے کیبجائے بعدت حق کا سبب بنتا ہے۔خود مقربین اور اولیاء اللہ بھی ایسے متوسلین سے راضی نہیں ہو سکتے ۔

معترضین جو محض توسل کو تعبد بتلا کر توسل ہی سے انکار کرتے ہیں وہ اللہ کی ایک نعمت سے خود کو محروم کرتے ہیں ۔ جو لوگ اعمال ہی کو وسیلہ سمجھتے ہیں وہ﴿ ان اللہ یغفر الذنوب جمیعاً ﴾النور ع ٦) یعنی اللہ تمام گناہوں کو بخش دے گا اس کے کرم کی نظر انداز کرتے ہیں۔البتہ اعمال کی اہمیت ذہن نشین کرانے کیلئے یہ تعبیر مفید ضرور ہے۔

بہترین توسل رحمت الٰہی کا ہے جو کسی مقرب کے توسل اور اعمال صالحہ کا نچوڑ ہے ﴿وما ارسلنك الا رحمة للعلمين﴾(انبیاء ع ۷) یعنی ہم نے سارے جہاں کے لئے تم کو رحمت بنا کر مبعوث کیا ہے۔ بقول کسے ع

رحمت پرورد گار صورت انسان رسید۔

"پیر پرستی رسول پرستی" یہ الفاظ بمعنی اتباع کامل استعمال ہوتے ہیں مگر ان کو پرستش کے مفہوم پر ڈھال کر شرک ٹھہرانا ایک عنادیہ مسلک ہے۔ پیر پرستی رسول پرستی بمعنی محبت و الفت بھی مقصود ہوتا ہے۔" المرء مع من احب "یعنی آدمی اس کے ساتھ رہیگا جس سے اس کو قلبی تعلق ہو۔ کا مصداق ہوتا ہے

مقدس اشیاء کی تعظیم شرک نہیں۔ان آیات پر غور کیجئے کہ یوسف علیہ السلام کا

قمیص مستعملہ ﴿ اذھبوا بقمیصی ھذا فالقوہ علی وجہ ابی یات بصیرا ﴾ (یوسف ع ۱۰) یعنی مراد یہ قمیص لے جاو اور اس کو میرے والد کی آنکھوں سے لگاو وہ بینا ہو جائیں گے۔ ﴿فلما ان جاء البشیر القٰہ علٰی وجھہ فارتد بصیرا﴾ (یوسف ع ۱۱) جب خوش خبری لے کر آیا (قمیص کے ساتھ اور قمیص کو (یعقوب کی) آنکھوں سے ملا تو وہ بینا ہو گیا۔ یعقوب کی محبت والی آنکھوں ﴿وابیضت عینہ من الحزن فھو کظیم﴾ (یوسف ۱۰) اس کی (یعنی یعقوب کی) آنکھیں بے نور ہو گئی تھیں غم سے اور وہ گھٹ رہا تھا محبت کے مارے) کیلئے مداوا بنتا ہے مگر اس استفادہ کیلئے چشم یعقوب کی ہی محبت بھی شرح ہے۔ بقول شاعر

دماغ ودل در اپنی گاہے گاہے پارہ می گردد　　خدا آباد تر ساز و خرابات محبت را
عقل کئے واند کہ مومن رمز از کجا است　　ایں حکایت را بیان دیگر است

محفوظ اثار تابوت سکینہ کے اثرات مسلمہ ہیں۔ (بقرہ ع ۳۲) آثار رسول کریم یا آثار اولیاء اللہ سے محبت کے اظہار کو پرستش سے تعبیر کرنا صرف معاندانہ رویہ ہے۔ عوام میں توسل اور تعبد کے صحیح امتیاز کے ساتھ عمل کرنے کی ہدایت کی جائے۔ تو زیادہ بہتر ہے۔

سمع موتی کی بحث۔ اولیاء اللہ سے توسل سے متعلق ایک شبہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا وہ ہماری آواز سن سکتے ہیں۔ جو ہماری مدد کیلئے اللہ کی بارگاہ میں ہماری استدعا پیش کریں گے۔ جبکہ قران نے فرمایا ہے کہ ﴿ انک لا تسمع الموتی ولا تسمع الصم الدعاء ﴾ (نمل ع ٦) تم مردوں کو سنا نہیں سکتے اور نہ تم بہروں کو سنا سکتے ہو) اس لئے یہاں اس مسئلہ کو بھی واضح کر دینا ضروری ہے۔ جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارک ہمارے احساسات سے بالاتر ہے اور جس طرح نبی کے احکام پر جان دینے والے

شہداء کی حیات ﴿بل احیآء و لکن لا تشعرون﴾ (بقرہ ع ۱۸) ہمارے فہم وادراک سے بالاتر ہے اس طرح کے صالحین اور اولیاء اللہ کی حیات ﴿من عمل صالحاً من ذکر او انثی وھو مومن فلنحیینہ حیوٰۃ طیبۃ﴾ (النحل ع ۱۳) ایماندار صالحین خواہ مرد ہوں کہ عورت ان کو ہماری طرف سے ایک خوشگوار زندگی بخشی جائے گی) کے یہی سمجھنے سے ہم قاصر ہیں۔ کافر بدکردار کی میت کے مماثل مسلم میت کو نہیں سمجھا جاسکتا۔ پھر مسلمانوں میں اعمال کے لحاظ سے درجات مقرر ہیں۔ ﴿ولکل درجٰت مما عملوا﴾ (انعام ع ٦) یعنی تمام درجات عمل کے مطابق ہوں گے۔ ہیرا بھی ایک پتھر ہے لیکن ہیرا اور پتھر میں فرق ہوتا ہے۔

آیت ﴿انک لا تسمع الموتیٰ﴾ میں سمع میت کی نفی نہیں فرمائی گئی ہے بلکہ استماع میت کی نفی ہے۔ یہ نہیں فرمایا کہ میت نہیں سن سکتی بلکہ ارشاد ہوا کہ تم نہیں سنا سکتے۔ نقص میت کا بتایا نہیں گیا ہے بلکہ زندوں کی کمزوری اور کوتاہی کا اظہار فرمایا گیا۔ جبکہ ایک زندہ شخص میت کے جسمانی کان سے میت کے سنوارنے کی توقع رکھتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اس آیت میں جسمانی حواس کی مماثلت دی گئی کہ جس طرح کہ مردہ اپنے حواس جسمانی سے کام نہیں لیتا اسی طرح کافر زندہ رہنے کے باوجود بھی ناصح کے آواز پر بھی کان نہیں دھرتے چنانچہ اس کے بعد ہی ارشاد ہوا ہے ﴿و ما انت بھٰدی العمی عن ضلٰلتھم ان تسمع الا من یؤمن باٰیٰتنا فھم مسلمون﴾ (النمل ع ٦) یعنی اور نہ تم اندھے کو دکھلا سکتے جبکہ وہ راستہ بھٹک جائے۔ تمہاری آواز کو تو وہ سنے گا جو ہماری بات پر یقین اور ایمان رکھتا ہو اور وہ فرمانبردار بھی ہو) اسی طرح سورہ انعام ع ۴ میں ارشاد ہوتا ہے ﴿والذین کذبوا باٰیٰتنا صم و بکم فی الظلمٰت﴾ یعنی جو ہماری ہدایت واحکام کے منکر ہیں وہ اندھے اور بہرے ہیں اور تاریکی میں پڑے ہیں) اسطرح کفار کے لئے سورہ اعراف ع ۲۲

میں ارشاد ہوتا ہے ﴿لهم قلوب لا یفقهون بها ولهم اعین لا یبصرون بها ولهم اذان لا یسمعون بها اولٓئك كالانعام بل هم اضل اولٓئك هم الغٰفلون﴾ یعنی ان کے دل ہیں مگر سمجھتے نہیں ان کی آنکھ ہیں مگر دیکھتے نہیں ان کے کان ہیں مگر سنتے نہیں وہ جانور کے برابر بلکہ جانور سے بھی بدتر ہیں وہ غفلت میں ہیں) بہر حال ان آیات کے ملاحظہ سے واضح ہو جاتا ہے کہ میت جس طرح اعضائے جسمانی سے کام نہیں لیتی اسطرح کفار بھی جسمانی اعضاء مکمل ہونے کے باوجود اپنے حواس سے کام نہیں لیتے۔ اور یہ آیات ان کافروں کی حالت کو بتاتے ہیں جو بقید حیات ہیں مگر میت سے متعلق یہ ہو سکتا ہے کہ ان کے اعضاء جسمانی کام نہ دیں مگر ارواح کے احساسات کی اس لئے نفی نہیں ہوتی اور نہ ارواح ان تقذات کے پابند ہو سکتے ہیں۔ قید جسمانی سے آزادی کے بعد ہی تو میت کا اطلاق ہوا انقطاع عمل جسمانی ہی کو موت کہا جاتا ہے۔ صالحین کے ارواح کو کامل آزادی حاصل رہے گی ۔ یہ احادیث صحیحہ سے ثابت ہے اس لئے ارواح سے توسل کرنے سے متعلق اشتباہ باقی نہیں رہتا۔

حقیقت و مجاز میں امتیاز۔ مسئلہ استعانت کا ایک دوسرا رخ حقیقت و مجاز ہے۔ حقیقی مالک الملک باری تعالیٰ ہے مگر جن کو ملک و سلطنت عطا ہوں وہ مالک مجازی ہیں) ﴿ولله میراث السمٰوات والارض﴾ آل عمران ع ۱۸) یعنی وارث و مالک حقیقی وہی ہے لیکن احکام و روایت کے تحت مورث اور وارث کی ملک مجازی ہوتی ہے ﴿ان الامر كله لله﴾ (آل عمران ع ۱۶) اور ﴿ان الحكم الا لله﴾ (انعام ع ۷) یعنی حاکم اور آمر حقیقی اسی کی ذات ہے اسی کے احکام نافذ العمل ہونے کے لائق ہیں۔ مگر اس عالم ظاہری میں جو اس کے احکام کو روبعمل لا رہا ہے وہ اولی الامر مجازی ہے ﴿ء انتم تزرعونه ام نحن الزٰرعون﴾ (الواقعہ ع ۲) یعنی کیا تم اگا رہے ہو یا ہم اگا رہے ہیں۔ ﴿والبلد الطيب يخرج نباته باذن

ربہ﴾ (اعراف ع ۷) یعنی اچھی زمین اللہ ہی کے حکم سے پودے اگاتی ہے اور ﴿ما کان لکم ان تنبتوا شجرھا﴾ (نمل ع ۵) یعنی تمہارے بس کی چیز نہیں کہ تم زمین کو سرسبز کردو یعنی حقیقت میں کھیتی کا اگانے والا ﴿فالق الحب والنوی﴾ (انعام ع ۱۲) یعنی دانہ اور گٹھلی کو پھاڑنے والا وہی پروردگار ہے اور ان آیتوں میں اس حقیقت کی طرف متوجہ فرمایا گیا ہے لیکن جب کسی کو زارع یا مزارع مجازاً کہا جاتا ہے تو ان آیات کے خلاف نہیں۔

﴿من کان یرید العزۃ فللہ العزۃ جمیعا﴾ (فاطر ع ۲) سے حقیقی عزت مراد ہے۔ اور ﴿وللہ العزۃ و لرسولہ و للمومنین﴾ (منافقون ع ۱) میں حقیقی اور مجازی دونوں کو ایک جا بیان کیا گیا ہے۔ ﴿ان القوۃ للہ جمیعا﴾ (بقرہ ع ۲۰) سے مراد قوی حقیقی وہی ذات خداوندی ہے۔ ﴿ویزدکم قوۃً الی قوتکم﴾ (ھود ع ۵) یعنی اور تمہاری طاقت کو بڑھا کر اور زیادہ طاقت ور کرے گا۔ اور ﴿کانوا اشد منھم قوۃ﴾ (روم ع ۱) میں جس قوت کی اضافت بندے کی طرف دی گئی ہے وہ مجازی ہے۔ ﴿فللہ المکر جمیعاً﴾ (رعد ع ۶) یعنی سب تدبیر اللہ ہی کی ہے۔ حقیقی مدبر وہی ہے انسان کے تدابیر مجازاً ہوتے ہیں انسان سبب بنتا ہے جیسے کہ ﴿وقد مکروا مکرھم﴾ (ابراہیم ع ۷) یعنی اور انہوں نے اپنی چال چلی، میں بندے کی طرف منسوب کیا گیا۔ ﴿و من یرزقکم من السماء والارض﴾ (نمل ع ۵) یعنی کون تمہیں آسماں اور زمین سے رزق دیتا ہے اور ﴿وھو یطعم ولا یطعم﴾ (انعام ع ۲) یعنی جو پرورش کرتا ہے اور وہ پرورش نہیں کیا جاتا، رزاق حقیقی حق تعالیٰ ہی ہونے کی وضاحت فرمائی گئی ہے اور ﴿ویطعمون الطعام علی حبہ مسکینا ویتیما واسیرا﴾ (الدہر ع ۱) یعنی اس کی محبت کی وجہ سے مسکین اور یتیم اور اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں۔ میں مجازی حیثیت کو واضح کیا گیا ہے۔ ﴿فابتغوا عند اللہ الرزق﴾ (عنکبوت ع ۲) یعنی اللہ کی جناب سے ہی رزق چاہو، حقیقی رزاق خدا کو جانو اور حقیقت میں

تمہارا ملجا اسی کی ذات ہونی چاہئے اس کا سبق دیا گیا مگر ﴿لایسئلون الناس الحافاً﴾ (بقرہ ع ۳۷) یعنی وہ لوگوں سے لپٹ کر نہیں مانگتے اور ﴿واما السائل فلا تنهر﴾ (والضحیٰ ۱۰) یعنی اور سائل کو نہ ڈانٹ' میں غیر اللہ سے استمداد کو اور استعانت کو جو روا رکھا گیا ہے اس کی مجازی حیثیت ہے اور ﴿و ما النصر الا من عند الله﴾ (ال عمران ۱۳) یعنی اور مدد تو اللہ کی طرف سے ہی ہے سے اس حقیقت کو منکشف فرمایا گیا ہے کہ مدد و نصرت خواہ تحت اسباب ہو کہ تبرک اسباب خواہ بالواسطہ ہو کہ بلاواسطہ ہر قسم کی مدد اللہ ہی کی طرف سے ہوتی ہے پھر آیات ذیل ﴿ ان تنصروا الله ينصركم﴾ محمد ع ۱) یعنی اگر تم اللہ کی مدد کرو وہ تمہاری مدد کرے گا۔ اور ﴿ولينصرن الله من ينصره﴾ (الحج ع ۶) یعنی اللہ اس کی مدد کرتا ہے جو اس کے دین کی مدد کرتا ہے۔ اور ﴿وليعلم الله من ينصره و رسله﴾ (حدید ع ۳) میں جو اللہ نے بندوں سے مدد مانگی ہے اس کا مقصد احکام کے نفاذ و عمل میں سبب بننے کا بندوں سے مطالبہ فرمایا گیا ہے۔

پیغمبروں نے جو عوام سے مدد چاہی ﴿فالذين امنوا به و عزروه ونصروه﴾ (اعراف ع ۱۹) یعنی جو لوگ اس پر ایمان لائیں اور اس کی تعظیم کریں اور اسکو مدد دیں۔ اور ﴿قال من انصاری الی الله﴾ (ال عمران ع ۵) کون میرے ساتھ اللہ کے مددگار ہیں اور ﴿وشاورهم في الامر﴾ (آل عمران ع ۱۷) یعنی معاملات میں ان سے مشورہ کرو) یہ سب تحت اسباب مجازات ہیں جو قطعاً جواز رکھتے ہیں۔ انسان کو ایک دوسرے کی مدد کرنے کی ہدایت فرمائی گئی بلکہ مدد کرنا فریضہ قرار دیا گیا ہے۔ ﴿و تعاونوا على البر والتقوىٰ﴾ (مائدہ ع ۱) نیک کاموں اور تقویٰ میں ایک دوسرے کی مدد کرو۔ اور ﴿و ان استنصروکم في الدين فعليكم النصر﴾ (انفال ع ۱۰) اور اگر تم سے دین کے متعلق مدد چاہیں تو تم پر مدد دینا فرض ہے) اور اس امداد باہمی کے جذبے کو اتنا ابھارا گیا کہ ﴿ من ذاالذی يقرض

اللہ قرضاً حسناً فیضٰعفہ لہ اضعافا کیثرۃ (بقرہ ع ۳۲) کون ہے جو اللہ کو ایک اچھا قرضہ دے گا تاکہ وہ اس کو بہت زیادتی کے ساتھ لوٹا دے) مخلوق کی امداد کو خالق کی امداد قرار دیا گیا ﴿و ما رمیت اذ رمیت و لکن اللہ رمٰی﴾ (انفعال ع ۲) اور جب تو نے پھینکا تو تو نے نہیں پھینکا بلکہ اللہ نے پھینکا) سے خدائی طاقت کا اظہار رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ سے ہونا بتلایا گیا ہے۔ اگر کوئی رسول اللہ کے دست مبارک کو خدا کا ہاتھ سمجھنے لگے تو غلط ہوگا اور اگر کوئی اس مافوق الفطرت واقع کو رسول اللہ کی (بشری) طاقت سمجھ لے تو بھی درست نہ ہوگا۔ اپنے مظہر کو اللہ نے اپنے طرف منسوب فرما کر بیان فرمایا ﴿ان الذین یبایعونك انما یبایعون اللہ ید اللہ فوق ایدیھم﴾ (فتح ع ۱) یعنی وہ لوگ جو تجھ سے بیعت کرتے ہیں وہ اللہ سے ہی بیعت کرتے ہیں اللہ کا ہاتھ اس کے ہاتھوں پر ہے۔ چونکہ رسول حق تعالیٰ کے نمائندہ ہوتے ہیں اس لئے نمائندہ کے ہاتھ پر بیعت کو خدا کے ہاتھ پر بیعت قرار دیا گیا۔ نائب کے ہاتھ کو منیب نے اپنا ہاتھ قرار دیا۔ اس قسم کے اضافات۔ منسوبات۔ انتسابات۔ مجازات۔ منافی توحید نہیں ہیں بلکہ معاون فہم ہوتے ہیں اسی طرح سے بیت اللہ کو اپنے طرف منسوب فرمالیا "بیتی" یعنی میرا گھر کہہ دیا ورنہ اللہ تعالیٰ مقام 'حیز' قید سب سے بے نیاز ہے۔ بیت اللہ کی طرف رخ کرنے کا ضرور حکم دیا گیا ﴿فولوا وجوھکم شطرہ﴾ (بقرہ ع ۱۷) یعنی اپنے چہروں کو اس کی طرف پھیر دو مگر ساتھ ہی ساتھ فرمایا ﴿لیس البر ان تولوا وجوھکم قبل المشرق والمغرب و لکن البر من اٰمن باللہ والیوم الاٰخر﴾ (بقرہ ع ۲۲) یعنی نیکی یہ نہیں کہ تم اپنے چہروں کو مشرق اور مغرب کی طرف پھیرو بلکہ نیکی اس میں ہے اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان لایا اور ارشاد ہوا ﴿ولکل وجھۃ ھو مولیھا فاستبقوا الخیرٰت﴾ (بقرہ ع ۱۸) یعنی ہر ایک کے لئے ایک سمت ہے جدھر وہ منہ کرتا ہے پس نیکیوں کو ایک دوسرے سے آگے بڑھ کر

حاصل کرو اور ﴿ولله المشرق والمغرب فاینما تولوا فثم وجه الله﴾ (بقرہ ع ۱۴) یعنی مشرق اور مغرب (سارے اسمات) اللہ ہی کے لئے ہے جدھر بھی تم رخ کروگے ادھر اللہ موجود ہے یعنی اصل اہمیت تعمیل احکام فرمانبرداری و ایمان کو حاصل ہے اور بیت اللہ کی طرف رخ رکھنا لازمی قرار دئے جانے کے باجود بیت اللہ کی عبادت مقصود نہیں بلکہ ﴿فلیعبدوا رب هذا البیت﴾ (قریش) صرف ایک رب کعبہ ہی کی عبادت کا حکم ہے۔

شعائر اللہ کی تعظیم ﴿ان الصفاوالمروة من شعآئر الله﴾ (بقرہ ع ۱۹) یعنی بے شک صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں۔ اور ﴿یآیها الذین امنوا لا تحلوا شعائر الله ولا الشهر الحرام ولا الهدی﴾ (مائدہ ع ۱) یعنی اے ایمان والوں اللہ کے نشانیوں کی بے حرمتی نہ کرو اور نہ حرمت والے مہینہ کی اور نہ قربانیوں کی۔ ﴿ فیه ایٰت بینٰت مقام ابراهیم ﴾ (ال عمران ع ۱۰) اس میں کھلے کھلے نشان ہیں مقام ابراہیم) اور ﴿ واتخدوا من مقام ابرٰهیم مصلی ﴾ بقرہ ع ۱۵) اور ابراہیم کے مقام کو قبلہ بناؤ ۔ اور ﴿والبدن جعلنها لکم من شعآئر الله لکم فیها خیر﴾ (حج ع ۵) اور قربانی کے اونٹوں کو ہم نے تمہارے لئے اللہ کے نشانوں سے ٹھہرایا ہے تمہارے لئے ان میں بھلائی ہے) اور ﴿ومن یعظم شعائر الله فانها من تقوی القلوب ﴾ (حج ع ۴) اور جو کوئی اللہ کی نشانیوں کی تعظیم کرتا ہے تو یہ دلوں کے تقوی ہے۔ جن چیزوں کو اللہ نے اپنے طرف منسوب فرمایا ہے ان کی تعظیم اصل ایمان قرار دی گئی۔

ابراہیم اور اسماعیل کا اسوہ ۔ اب اللہ نے کن چیزوں کو اور کن سے متعلقہ چیزوں کو اپنا لیا ہے غور طلب ہے۔ ابراہیم اور اسماعیل کا قصہ بیان کرنا موجب طوالت ہوگا۔ صرف اتنا کہدینا کافی ہے کہ انھوں نے اپنے عزائم اور اپنے فطری مطالبات نفس کو حکم خداوندی پر قربان کردیا۔ خود کو خدا کے تفویض کردیا تو ان کو ﴿ فلما اسلما﴾ کا صداقت نامہ عطا

فرمایا گیا۔﴿اذ قال له ربه اسلم قال اسلمت لرب العلمين﴾بقرہ ع۱۶)جب اس کے رب نے کہا فرمانبردار بنو کہا میں جہانوں کے رب کا فرمانبردار ہوا"باقی" کے حکم کے تحت انھوں نے خود کو فنا کر دیا تو اللہ نے نہ صرف ان کے نام کو بلکہ ان کے ہر کام کو ان کی ہر حرکت کو اپنی طرف منسوب فرمالیا ان کی ہر ادا کو اپنالیا اور ان کی تقلید ان کے حرکات کی نقالی کو عبادت اور مناسک قرار دیا﴿و تركنا عليه في الاخرين﴾(الصافات ع ۳)اور ہم نے آنے والے لوگوں کیلئے یادگار بنادی' اسطرح اس کی یادگار قائم کر کے اس فرمانبردار کی یاد دلوں میں تازہ کر دی گئی اور یہ سبق دیا گیا کہ جو "باقی" کے حکم کے تحت فنا ہوتا ہے تو وہ کسی نہ کسی طرح باقی رکھا جاتا ہے۔

عشق آمد و شد جو خونم اندر تگ و پوست تا کرد مرا تہی و پر کرد زدوست
اجزائے وجود ہمگی دوست گرفت نامے است زمن برمن باقی ہمہ اوست

مجموعی طور پر ارشاد ہوا کہ﴿ ومن احسن دينا ممن اسلم وجهه لله وهو محسن و اتبع ملة ابراهيم حنيفا و اتخذ الله ابراهيم خليلاً﴾النساء ع۱۸) یعنی اس سے بہتر کس کا دین (طریقہ زندگی) ہو سکتا ہے جو اللہ کے احکام کے سامنے سرنگوں ہوا اور وہ حسن عمل رکھتا ہو اور جو ہمارے مخلص بندے ابراہیم کے طریقہ پر یکسو ہو کر چلے کیونکہ اللہ نے ابراہیم کو اپنا دوست بنالیا۔ اور ارشاد ہوا﴿ ومن يرغب عن ملة ابراهيم الا من سفه نفسه﴾(بقرہ ع۱۶) یعنی ابراہیم کے دین سے وہی منہ موڑے گا جو پاگل ہو۔ اور سارے دین کو ابراہیم کے طرف منسوب فرمادیا حالانکہ وہ خدا ہی کا دین ہے۔اس کے احکام کی تعمیل ہے۔ مگر اسطرح فرمانبرداری کی یاد قائم کر دی گئی اور دوسروں کو درس دیا گیا کہ جو ہماری راہ میں اسطرح فنا ہو گا ہم اس کو اسطرح باقی رکھیں گے۔نہ صرف ابراہیم بلکہ عمومیت کے ساتھ ارشاد ہوتا ہے﴿لقد كان لكم فيهم اسوة حسنة لمن كان يرجوا الله

والیوم الاٰخر﴾ (ممتحنہ ع ۱) جو اللہ سے ملنے اور آخرت کی امید رکھتا ہے تو اس کو نیک لوگوں کے اسوہ کی اتباع کرنی چاہئے۔ اور ارشاد ہوا ﴿یوم ندعوا کل اناس بامامھم (بنی اسرائیل ع ۸) یعنی جس دن حشر ہوگا ہر گروہ کو اس کے مقتدا کے ساتھ طلب کیا جائے گا۔ کس کو امام بنائیں کسی کی رفاقت اختیار کریں واضح فرمادیا گیا "فاولٓیک مع الذین انعم اللہ علیھم من النبین والصدیقین والشھدآء والصلحین وحسن اولٓیک رفیقا (النساع ۹) یعنی یہ لوگ ان کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام کیا یعنی نبیوں' صدیقوں' شہیدوں اور صالح لوگوں کے ساتھ اور یہ بڑے اچھے ساتھی ہیں فرمانبرداروں کے عملیات کو اپنی طرف منسوب فرمالیا اور اپنے راستے اور اپنے دین کو فرمانبرداروں کے طرف منسوب کردیا۔ اپنے ہی احکام کی اجتماعی اتباع کو رفاقت بتلا کر اپنے فرمانبرداروں کی طرف اس کی نسبت دے دی۔

ان سب کا ماحصل یہ ہوا کہ حق سے وابستگی رہے تو ہر عمل حق اور غیر حق سے تعلق کے ساتھ ہر عمل باطل۔ کسی نہ کسی درجہ کا شرک یہاں تک کہ اتباع نفس بھی ایک درجہ کا شرک۔ جو بندہ اللہ کے ارادے کے تحت خود کو بے خود کردے "فلما اسلما" اور اپنی ہر حرکت و سکون کو اللہ کے لئے وقف کردے ﴿ان صلاتی و نسکی و محیای و مماتی للہ رب العلمین﴾ (انعام ع ۲۰) اور جو حنیفا مسلما کا درجہ حاصل کرلے تو ایسے بندہ سے جو مقام منسوب ہوتا ہے اس کو بھی اہمیت حاصل ہوجاتی ہے۔ ﴿واتخذوا من مقام ابرٰھیم مصلی﴾ (بقرہ ع ۱۰) اور سارا دین بھی اسی کے طرف منسوب کردیا جاتا ہے

اتنی بحث کے بعد اعانت و استعانت حقیقت و مجاز منسوبات انتسابات و اضافات اور شعائر کے مدارج ان کی حیثیتیں اور نزاکتیں واضح ہوچکیں۔

ایک صحابی علقمہ کے یہ وسوسہ گذرا کہ ﴿ اھدنا الصراط المستقیم﴾ مسلمان دعا کرتے

ہیں اس کے معنی یہ ہیں کہ مسلمان اپنے دین کے سچے سیدھے ہونے کا یقین نہیں ہے۔ ایسے دین مین جن کے متعلق خود اس کے پیرو تک نہیں رکھتے ہیں میں رہنا نہیں چاہتا۔ چنانچہ وہ مرتد ہوگئے اور روم کے عیسائیوں میں جاملے۔ یہ حضرت ابو بکر صدیق کی خلافت کا دور تھا۔ حضرت ابو بکر نے باب العلم سیدنا علی کرم اللہ وجھہ سے خواہش کی کہ آپ علقمہ کے اس شک اور وسوسہ کو حل فرمائے۔ مظهر العجائب و الغرائب نے علقمہ کا موسومہ ایک خط لکھا جس کی ابتداء یوں فرمائی۔" بسم الله الرحمن الرحيم " ﴿حم تنزيل الكتب من الله العزيز العليم غافر الذنب و قابل التوب شديد العقاب ذى الطول﴾(المومن ع ۱) یعنی اس خط کو اس ہستی کے نام سے شروع کرتا ہوں رحمٰن اور رحیم ہے۔ یہ کتاب (قران) نازل فرمائی گئی ہے۔اس اللہ تعالی کی جانب سے جو غالب ہے اور ہر چیز کا جاننے والا اور گناہ بخشنے والا اور توبہ قبول کرنے والا ہے۔ سخت سزا دینے والا ہے ۔اور قدرت والا ہے۔اس کے مشکل کشا نے علقمہ کی یوں عقدہ کشائی فرمائی کہ اهدنا کے معنی ہم کو ثابت قدم رکھ اور انبیاء کے طریقہ پر رہنے کیلئے ہمارے دلوں کی حفاظت فرما کے ہیں۔ یہ خط لکھکر حضرت مولی نے حضرت ابو بکر کے پاس بھیجدیا۔حضرت ابو بکر نے من و عن اس خط کو سرکاری آدمی کے ذریعہ علقمہ کے پاس روم روانہ کردیا۔ علقمہ اس وقت گرجا میں مصروف بہ عبادت تھے۔جب فارغ ہوئے تو قاصد نے خط حوالے کیا جس کو علقمہ نے پڑھا اور رو پڑے اور کہنے لگے "ایسے خدا کی نافرمانی کسطرح کیجائے جو ایک بار ڈراتا ہے تو تین بار قصور معاف کرنے کا وعدہ فرماتا ہے۔

علقمہ دوبارہ مشرف باسلام ہوئے۔یہ واقعہ اس آیت کی تشریح کیلئے کافی ہے۔اهدنا استعانت عطا کرنے کیلئے دعا ہے۔جیسے "ربنا لا تزغ قلوبنا بعد اذهديتنا" کا مفہوم ہے۔ اشیاء عالم (جو ان کیلئے بنائے گئے ہیں) ان کو حسب ضرورت اور بہ طریقہ جائز استعمال کرکے

یا انسان اپنے اسباب معیشت فراہم کرے اور پھر حقوق العباد اور حقوق اللہ کی تکمیل کرے تو ساری زندگی کا شمار عبادت ہوگا۔ جو مقصود آفرنیش ہے۔ جس کے بعد ہی رضوان حق نصیب ہوتی ہے۔ جو عبد کا منزل مقصود ہے۔

(۶) اھدنا الصراط المستقیم (ترجمہ)۔ ہم کو سیدھی راہ پر چلتے رہنے کی ہدایت فرما۔

ہدایت کا مفہوم۔ ہدایت کے معنی صحیح راستے کی رہنمائی کرنا جو مطلوب یعنی منزل مقصود تک پہنچادے۔ دنیوی زندگی میں ہدایت تین طرح پر ہوتی ہے ۔اول فطری ہدایت ہے جو عام ہے اللہ تعالی نے ہر شئی کی تخلیق کے ساتھ ہی عطا فرمایا ہے۔ جیسے ارشاد ہے۔ ﴿اعطی کل شئی خلقه ثم ھدی﴾ (طہ ع ۲) یعنی ہر چیز کو اس کا وجود بخشا پھر اسے اپنے کمال کی راہ دکھائی یا فرمایا ﴿ والذی قدر فھدی ﴾ (اعلی) یعنی اللہ کی وہ ہستی ہے جو قصد کرتی ہے پھر ہدایت عنایت کرتی ہے۔ اس نوع کی ہدایت ہر چیز کی فطرت میں موجود ہے۔

دوسری وہ ہدایت ہے جو انسان کو نبیوں کے ذریعہ سے ملتی ہے۔ یعنی انبیاء کی دعوت الی الحق ﴿وجعلنا منھم ائمة یھدون بامرنا ﴾ (سجدہ ع ۳) یعنی اور ان میں سے ہم نے امام بنائے جو ہمارے حکم سے ہدایت کرتے ہیں۔ یہ ہدایت سب انسانوں کیلئے عام ہے جس کے لحاظ سے قران کو ﴿ھدی للناس و بینٰت من الھدی﴾ (بقرہ ع ۲۳) یعنی لوگوں کے لئے ہدایت ہے اور ہدایت کو پانے کے واضح احکام کہا گیا ہے جو منجانب اللہ نازل ہوا سورہ الدھر میں ارشاد ہے ﴿انا ھدینه السبیل اما شاکرا و اما کفورا﴾ تیسری ہدایت وہ ہے جو آدمی کو صداقت کا راستہ اختیار کرنے اور اس پر استقامت پیرا رہنے اور خود کو زیادہ سے زیادہ صداقت پر رکھنے جستجو کرنے پر عطا ہوتا ہے ﴿ والذین اھتدوا زادھم ھدی ﴾ (محمد ع ۲) یعنی جو ہدایت اختیار کرتے ہیں اللہان کی ہدایت میں اضافہ فرماتا ہے۔

اور ﴿و من یؤمن بالله یھد قلبه ﴾ (تغابن ع ۲) یعنی اور اللہ پر جو ایمان لاتا ہے وہ اس

کے دل کو ہدایت دیتا ہے۔﴿والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا﴾(عنکبوت ع ۷) جو ہماری راہ میں کوشاں رہتا ہے ہم اسکو راستے دکھاتے ہیں) حدیث شریف ہے کہ من یرد اللہ خیرا یفقھہ فی الدین اللہ جس کی بھلائی چاہتا ہے اس کو دین کے معاملات سمجھنے کی صلاحیت عطا فرماتا ہے جنت میں ارواح کو پہنچادینے کے لئے ارشاد ہے کہ ﴿سیھدیھم و یصلح بالھم﴾(محمد ع ۱) یعنی انہیں (جنت) پہنچائے گا اور ان کی حالت سنوارے گا) اس ہدایت کا تعلق آخرت سے ہے۔

صراط مستقیم۔ وہ سیدھا راستہ جو بغیر کسی جھول کے راست منزل مقصود کو پہنچاتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جس راستے کی رہنمائی فرمائی ہے اس کے لحاظ سے انسان کو علم الاشیاء سے واقفیت رکھ کر صناعی صناع کا صحیح اور کامل احساس دل میں پیدا کر کے ان اشیاءے عالم (جو انسان کے لئے بنائے گئے ہیں) ان کو حسب ضرورت اور بہ طریقہ جائز استعمال کر کے انسان اپنے اسباب معیشت فراہم کرے اور پھر حقوق العباد اور حقوق اللہ کی تکمیل کرے تو ساری زندگی کا شمار عبادت میں ہو گا جو مقصود آفرینش ہے جس کے بعد ہی رضوان حق نصیب ہوتی ہے جو عبد کا منزل مقصود ہے

---

(۷) صراط الذین انعمت علیھم غیر المغضوب علیھم ولاالضآلین

(ترجمہ)۔ ان لوگوں کے راستہ پر جو تیرے انعام واکرام کے مستحق ہو چکے ہیں اور گمراہی وعتاب سے محفوظ رہے۔

اسی لئے ﴿وان ھذا صراطی مستقیما﴾(انعام ع ۱۹) یعنی یہ میرا راستہ ہے جو سیدھا ہے اپنے اس سیدھے راستہ کی نہایت سیدھے طریقہ کی آیت میں اپنے فرمانبرداروں کیطرف اضافت دے دی جو اس راستہ پر چل کر منزل مقصود کو پہنچ چکے ہیں۔

﴿اولئک الذین ھدی اللہ فبھداھم اقتدہ﴾(انعام ع ۱۰) سب انبیاء کو راستہ پروردگار کا

دکھایا ہوا ہے۔ اپنے ہی متعینہ طریقہ حیات کو پیغمبروں کی طرف منسوب فرمادیا۔

۷۔ اس پیرایہ بیان سے نہ صرف راستے کی خوبی اور صداقت بتلانا ہے بلکہ جو لوگ اس راستے پر چل کر مقرب بارگاہ ایزدی ہو چکے ہیں یعنی انبیاء والصدیقین و شہداء و صالحین ان کی پیروی اور اتباع کی طرف بھی اشارہ فرمایا گیا ہے۔

قابل غور نکتہ یہ ہے کہ تقرب بالفرائض سب کے لئے مشروع ہے۔ تقرب بالنوافل کے لئے بھی اگر حکم صادر ہوتا تو ایک تو تعمیل ہر ایک کیلئے ممکن نہ تھی دوسرے حکم ہونے کے بعد بالنوافل نہ رہتا بلکہ تقرب بالفرائض ہو جاتا۔ اس لئے اس خاص طرز بیان کے ساتھ ہر ایک کو اپنی اپنی صلاحیت اور استعداد کے موافق عمل کر کے حصول تقرب کا موقعہ دیا گیا۔

سورے کا خلاصہ۔ اس طرح اللہ کی صفات کاملہ کو پہچان لینا اور اپنی قوائی کو اللہ کی کامل فرمانبرداری یعنی عبادت میں لگا دینا اور اپنے کمزوریوں کو دور کرنے کی مدد اللہ سے طلب کرنا اور اس مقام پر پہنچنے کی دعا کرنا جہاں بڑے بڑے برگزیدگان الہی پہنچے اور زندگی کے ہر پہلو میں افراط اور تفریط سے بچنے کی آرزو کرنا اس دعا میں سکھایا گیا ہے۔ اور یہی مقصد قران کریم کے نزول کا ہے۔ اس لئے یہ دعا قرآن حکیم کی تعلیمات کا خلاصہ اور نچوڑ ہے۔

آمین! یعنی اے اللہ ہماری دعا کو قبول فرما۔ یہ بھی ایک دعا ہے مگر قران کا جز نہیں ہے۔ فاتحہ کے آخر میں اس کا پڑھنا صحیح احادیث سے ثابت ہے۔ حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب امام والضالین کہئے تو تم آمین کہو (بخاری)

عملی سبق۔ ”تخلقو باخلاق اللہ“ کی ہدایت کے تحت اس سورت میں ہم کو اپنی عملی دنیا کے نظم و نسق اور انتظام مملکت کیلئے کار آمد اسباق ملتے ہیں۔

جس طرح حکومت الہی میں ربوبیت رحمانیت اور رحمیت کار فرما ہے اسی طرح حکم اور حکومت کے پیش نظر عوام کے فلاح و بہبود کے کام رہنا چاہئے۔ رعایا پروری اور رعایا سے

کامل ہمدردی حاکم کا مطمع نظر ہونا چاہئے۔ حکام کو رعایا اور عوام سے بے تعلق نہ ہونا چاہئے۔ بلکہ انتہائی رحم و کرم سے تعلق باہمی قائم رکھیں۔ اگر یہ تعلق قائم ہو جائے تو جس طرح خدا کی ستائش اور ہمدردی اس کی بخشی ہوئی نعمتوں کا اعتراف ﴿الحمدلله رب العٰلمين﴾ میں کیا جاتا ہے اسی طرح عوام حکومت کے ممنون اور مداح رہیں گے۔ اور اس کے دل حکومت کے ساتھ محبت سے وابستہ ہو جائیں گے ﴿ملك يوم الدين﴾ سے یہ سبق ملتا ہے کے فرمانبردار اور مطیع رعایا کو انعام و اکرام سے سرفراز کیا جانا چاہئے۔ تا کہ فرمانبرداروں کی تعداد میں اضافہ ہو اور نافرمانوں کو سزا ملنی چاہئے تا کہ دوسروں کو خلاف ورزی کی جرات نہ ہو۔ جس کے بغیر حکومت کا قیام اور احکام کی تعمیل مشکل ہو جاتی ہے۔

﴿اياك نعبدوا اياك نستعين﴾ سے یہ سبق ملتا ہے کے رعایا نتیجتاً حکومت سے دلی طور پر وابستہ رہے گی اور اپنا دکھ درد اور تکالیف اور ضروریا حکومت کے آگے رکھے گی۔

﴿اهدنا الصراط المستقيم﴾ سے یہ سبق ملتا ہے کہ حکومت رعایا میں صحیح علم و ہدایت کی اشاعت کرے اور ان کی تعلیم و تربیت کا انتظام کرے۔ اور رعایا میں علم و ہدایت حاصل کرنے کا جذبہ ابھارے تا کہ مملکت کی ترقیوں میں وہ اپنا حصہ ادا کر سکیں۔

﴿ صراط الذين انعمت عليهم﴾ سے یہ سبق ملتا ہے کہ اطاعت گذار لوگ دوسروں کے لئے نمونہ ہوں گے۔ عوام صحیح رہنماؤں کی پیروی کریں۔ اور اچھوں کی صحبت سے استفادہ کرنے کا جذبہ اجاگر ہو ﴿غير المغضوب عليهم ولاالضّالين﴾ سے یہ سبق ملتا ہے کہ عوام قانون شکن افراد سے گریز کریں اور سماج دشمن عناصر کی صحبت سے احتراز کا احساس پیدا کریں۔

نوٹ:۔ اس تفسیر کا انگریزی میں بھی ترجمہ کردی اور اس کی اشاعت بھی ہو چکی ہے انگریزی داں حضرات اس سے استفادہ فرما سکتے ہیں۔